ترکی میں تحریکِ احیائے اسلام کی موجودہ حالت

دَورۂ ترکی کے مشاہدات

از جناب خلیل حامدی صاحب

سلجوقیوں اور عثمانیوں[1] کی تاریخ اسلامی تاریخ کا نہایت اہم باب ہے۔ ایشیائے کوچک میں جب سلاجقۂ روم کے بعد عثمانیوں نے زمامِ سلطنت ہاتھ میں لی تو اسلام کا کاروانِ حق نہ صرف ایشیا اور افریقہ کے اندر جادہ پیما ہوا بلکہ یورپ کی وادیوں میں بھی اُس نے قدم رکھے اور ویانا کی فصیلوں تک اُس کے جرسوں کی صدا بلند ہوئی۔ راقم الحروف نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر سلامت رکھے) کی رفاقت میں عربوں کو تو بارہا دیکھا ہے اور عربوں کی موجودہ تاریخ کا مفصّل مطالعہ کیا ہے، مگر سلاطینِ آلِ عثمان کے گہوارہ کو دیکھنے کا ابھی تک موقع نہ مل سکا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی تاریخ اور تہذیب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی معاشرتی زندگی کا مشاہدہ کیا جائے اور اُس کے آثار و دیار کو دیکھا جائے۔ عربوں کو چونکہ ہم نے خوب دیکھا ہے اور ہر علاقے کے عربوں کے قومی مزاج اور جداگانہ اجتماعی رنگ ڈھنگ کا مشاہدہ کیا ہے اِس وجہ سے اُن کی تاریخ اور ان کے مسائل کے بہت سے ایسے گوشے جو محض غائبانہ واقفیت کی بنا پر واضح نہیں ہو سکتے تھے ہمارے لیے اُن کا سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ عثمانیوں[2] اور عربوں کی تاریخ کا دھارا کم از کم ۵ سو سال تک مشترک رُخ پر بہتا رہا ہے۔ سلطان

---

[1] عثمانی سلاطین سے پہلے ایشیائے کوچک پر سلجوقیوں کا ایک خاندان حکمراں رہا ہے جو سلاجقۂ روم کہلاتا ہے۔ ان لوگوں کا زمانۂ حکومت سنہ ۱۰۷۷ء سے لے کر سنہ ۱۳۰۰ء تک رہا ہے۔ یعنی پانچویں صدی ہجری کے رُبعِ آخر سے لے کر ساتویں صدی ہجری کے اختتام تک۔ ان کے بعد عثمانی ترکوں کی باری آئی اور وہ سلاجقہ کے بعد بیسویں صدی عیسوی تک کوسِ حکرانی بجاتے رہے۔

[2] "ترکوں" کے بجائے "عثمانیوں" کی اصطلاح دانستہ استعمال کر رہا ہوں۔ ترک دوستوں نے مجھے بتایا کہ اس وقت اہلِ دین اور لادین عنصر کے اندر جو کشمکش برپا ہے اُس کی وجہ سے بعض اصطلاحات میں بھی امتیاز پیدا ہو گیا ہے۔ لادین عنصر

سلیم اوّل (۱۵۱۲ء) کے داخلۂ بغداد سے لے کر سلطان عبدالحمید ثانی (۱۹۰۸ء) کی معزولی تک دونوں قوموں کی تاریخ ایک ہی قالب میں ڈھلتی رہی ہے۔ اس لیے عربوں کی تاریخ کا ہمہ پہلو جائزہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک عثمانیوں کی تاریخ، ان کی تہذیب اور ان کے آثار و دیار سے مکمل براہِ راست واقفیت نہ ہو۔ علاوہ بریں ترکی قوم بجائے خود بھی اسلامی دنیا کی ایک نہایت اہم قوم ہے جس کا بناؤ اور بگاڑ پوری دنیا کے مسلمانوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس بنا پر بھی یہ ضروری ہے کہ ہم اس قوم کو قریب سے دیکھ کر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس وقت اس کے اندر کیا رجحانات کار فرما ہیں۔ اسی احساس کے تحت مدت سے یہ خواہش تھی کہ ترکی کا سفر کیا جائے اور عثمانی ترکوں کے مراکز اور تہذیبی باقیات کو دیکھا جائے۔ یہ جذبہ پکتا رہا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے اس سال رمضان المبارک کے اندر اسے بروئے کار لانے کا موقع فراہم کر دیا۔

سعودی عرب۔ روانگی ۱۲ نومبر ۱۹۶۶ء کو راقم الحروف ایک صحافی وفد کے ہمراہ، جسے سعودی عرب کی وزارت اطلاعات نے دعوت دی تھی، جدہ روانہ ہوا اور ۱۲ سے ۲۴ نومبر تک اس وفد نے جدہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، طائف اور ریاض کا دورہ کیا۔ اس سفر میں عمرہ اور زیارت مدینہ منورہ کے ساتھ ساتھ ہم نے بعض سعودی اداروں کو بھی دیکھا۔ اس کے بعد وفد کے دوسرے شرکا تو پاکستان واپس ہو گئے اور میں چند روز مزید سعودی عرب میں گزارنے کے بعد ۴ دسمبر ۱۹۶۶ء

*۔ ترک ملت اور ترک مفادات کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور اہل دین عنصر مسلم ملت یا عثمانی قوم کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ عثمانی کی نسبت بھی دراصل ترکوں کے مورثِ اعلیٰ عثمان کی طرف ہے جو ارطغرل کا بیٹا تھا۔ یہ ارطغرل بھی سلاجقہ کے ابنائے عم میں سے تھا اور ترکانِ غُز (جن کا اصل وطن ماوراء النہر کے اُس پار تھا) کی طرف منسوب تھا۔ اس کا قبیلہ ماوراء النہر سے ہجرت کر کے ایشیائے کوچک کے شمال مغرب میں آباد ہو گیا۔ رومی سلاجقہ نے جو اُس وقت یہاں کے حکمران تھے، ارطغرل کی جوانمردی، شجاعت اور جفاکشی کی بنا پر اسے چند علاقے جاگیر میں دے دیئے۔ اور جب سلاجقہ کے اندر ضعف اور زوال کے آثار اُبھرنے لگے تو اُس نے بڑھ کر سلطنت کی زمام سنبھال لی۔ ارطغرل کے بعد اُس کے بیٹے عثمان نے صحیح معنوں میں اس سلطنت کا تشخص قائم کیا۔ چنانچہ یہ سلطنت بعد میں اُسی کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوئی۔ عثمان خود بڑا مجاہد اور خدا پرست انسان تھا۔ اُس نے اس سلطنت کی بنیادیں جہاد فی سبیل اللہ اور اشاعتِ اسلام کے اصولوں پر قائم کیں۔ چنانچہ تاریخ نے اُسے غازی عثمان کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یہ لقب درحقیقت اُسے اپنے عہد کے شیخ الصوفیہ کی طرف سے اہل اللہ کے ایک بہت بڑے اجتماع میں دیا گیا تھا۔

کو ریاض سے بیروت کی طرف روانہ ہو گیا۔

میرے اس سفر کی اصل منزل لندن تھا۔ میں مولانا مودودی کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا۔ رابطۂ عالمِ اسلامی کے جنرل سیکرٹری شیخ سُرور الصّبان، امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن (جو شاہ فیصل کے چچا ہیں) اور بعض دوسرے ذمہ دار سعودی دوستوں کی خواہش تھی کہ مولانا محترم اگر ہمت پائیں تو پاکستان واپس جاتے ہوئے حجاز رکیں اور عمرہ اور زیارت سے مشرف ہوں۔ بلکہ سعودی عرب کی وزارتِ تعلیم کی طرف سے بھی یہ دعوت تھی کہ مولانا محترم ریاض یونیورسٹی میں کم از کم ایک تقریر ضرور کریں۔ وزارتِ تعلیم کے ڈائرکٹر کے الفاظ یہ تھے کہ "الاستاذ یوفّر الکلام لیصرفہ فی الریاض" (مولانا محترم گفتگو بچا کر رکھیں تاکہ اُسے ریاض میں صرف کریں)۔ میری ڈیوٹی لگائی گئی کہ مَیں ان حضرات کی خواہش کو مولانا محترم کی خدمت میں پیش کروں۔ چنانچہ اِسی دعوت نامہ کو لے کر مَیں ریاض سے ترکی اور پھر وہاں سے لندن جانا چاہتا تھا مگر کچھ ایسی رکاوٹیں راستے میں حائل ہو گئیں کہ میں لندن پہنچ کر مولانا محترم کی خدمت میں اُن کی روانگی سے قبل یہ دعوت بالمشافہہ پیش نہ کر سکا اور ترکی ہی میرے سفر کی آخری منزل ثابت ہُوا۔

<u>بیروت میں مختصر قیام</u> ۱۵ دسمبر کی رات بیروت میں گزاری۔ سردی سخت تھی مگر خوشگوار۔ مفتی اعظم فلسطین محمد امین الحسینی صاحب نے بیروت میں اپنا مہمان ٹھیرا لیا۔ مفتی صاحب خود تو بیروت شہر کے ایک کنارے محلہ قُرن الشُّباک میں رہتے ہیں مگر انہوں نے میرے قیام کے لیے خود ہی بیروت کے "ہوٹل لوکاندا امریکا الکبریٰ" کو تجویز کیا۔ میرے پیشِ نظر بیروت کا "العربی" ہوٹل تھا۔ مگر مفتی صاحب نے کہا کہ لوکاندا امریکا زیادہ صاف ستھرا ہے۔ صاف ستھرا سے مراد کمروں اور بستروں کی صفائی نہیں بلکہ اخلاقی صفائی ہے۔ بیروت کے ہوٹل اخلاقی صفائی سے بالعموم محروم ہیں۔ صرف ہوٹل ہی کیا پُورا شہر اخلاقی فساد میں مبتلا ہے۔ مولانا محترم فرمایا کرتے ہیں کہ "بیروت مرحاض البلاد العربیۃ" (بیروت عرب ممالک کا بیت الخلاء ہے)۔ مولانا محترم کی یہ مثال بالکل برحق ہے۔ ہمارے عرب دوست اِس مثال کو اکثر دُہرایا کرتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ امام اوزاعیؒ کا یہ شہر جو طبعی جمال اور جغرافیائی حُسن

ؒ امام اوزاعی رحمہ اللہ جو امامِ اہل الشام کہلاتے تھے بیروت میں مدفون ہیں۔ آپ کی قبرِ مبارک ساحلِ سمندر پر ہے اور عین اُن مراکز کی بغل میں ہے جہاں مرد و عورت ننگے نہاتے ہیں۔ اس پورے علاقے کا نام امام اوزاعیؒ ہے اور عیاشی اور بدکاری کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ سُن کر بڑا دکھ ہُوا کہ یہ علاقہ امام موصوف کے نام سے منسوب ہے۔

کی نعمت سے مالامال ہے، اخلاقی پستی میں بُری طرح گر چکا ہے۔ بلکہ اُس کی اخلاقی غلاظت کے چھینٹے دُور دُور تک پہنچ رہے ہیں اور اردگرد کے تمام عرب ممالک اُن سے ملوث ہو رہے ہیں۔ ترکوں اور عربوں کی نسلی جنگ میں بھی اس شہر نے نہایت اہم کردار ادا کیا تھا، اور موجودہ عرب اسرائیل جنگ کی تہ میں بھی بیروت کے مفاسد کا گہرا دخل ہے۔

مفتی اعظم فلسطین عربوں کی چلتی پھرتی تاریخ ہیں۔ مولانا محترم سے موصوف کو انتہائی محبت ہے۔ ہر محفل میں مولانا کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور نوجوانوں کو مولانا کی تصنیفات کے مطالعہ کا مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ ۱۹۶۴ء کی بات ہے کہ خاکسار بیروت میں تھا۔ مفتی صاحب نے خاکسار کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ میرے ساتھ شام کی جماعت اخوان المسلمون کے سربراہ اُستاذ عِصام عطّار بھی مدعو تھے۔ مفتی صاحب نے اس موقع پر بتایا کہ مولانا محترم سے پہلی مرتبہ اُن کی ملاقات ۱۹۳۵ء میں حیدر آباد دکن میں ہوئی تھی۔ مفتی صاحب مصر کے نامور لیڈر مرحوم محمد علی علوبہ پاشا کے ہمراہ ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے۔ جب حیدر آباد گئے تو لوگوں نے انہیں بتایا کہ ایک نوجوان جس کا نام ابوالاعلیٰ مودودی ہے بڑے مؤثر اور نرالے انداز میں اسلام کی دعوت پیش کر رہا ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب کو مولانا محترم سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا اور باقاعدہ ایک خصوصی دعوت کے ذریعہ اس ملاقات کا اہتمام ہوا۔ مفتی صاحب اپنی اس پُرانی ملاقات سے بڑے خوش تھے۔ بتانے لگے کہ مولانا کے اندر ایّامِ جوانی میں جس عزیمت اور پختگیٔ کردار کی جھلک دیکھی تھی آج بھی جب اُن کو دیکھتا ہوں تو پختگیٔ کردار اور استقامتِ فکر و نظر کا وہ پیکر نمونہ آنکھوں کے سامنے جھلک جاتا ہے۔ ہمارے ترک دوست صالح اُوزجان نے بتایا کہ مفتی صاحب سے جب کبھی میری ملاقات ہوتی ہے تو وہ مجھے یہی نصیحت کرتے رہتے ہیں کہ ترکی میں دعوتِ اسلامی کا صحیح خطوط پر کام کرنے کے لیے مولانا مودودی سے تربیت حاصل کرو۔ مفتی صاحب کے سکرٹری خلیل علیا صاحب نے ایک قیمتی قلم میرے سپرد کیا اور کہا کہ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ میری آرزو تھی کہ مَیں لندن جا کر مولانا محترم کی عیادت کرتا مگر بعض وجوہ کی بنا پر یہ موقع نہ مل سکا۔ مَیں مفتی صاحب کا سلام بھی مولانا محترم کی خدمت میں پیش کروں اور یہ قلم بھی اُن کی طرف سے مولانا کی خدمت میں ہدیہ کروں۔

آستانۂ خلافت میں | ۱۵ دسمبر ۱۹۶۸ء کو ۱ بجے SAS کے جہاز سے بیروت سے استنبول روانہ ہُوا۔ سوا گھنٹے کی پرواز کے بعد میں استنبول کے ایرپورٹ پر تھا۔ بیروت میں جس انقباض اور الم سے دوچار تھا عجیب بات ہے

کہ استنبول کے ایئرپورٹ پر قدم رکھتے ہی طبیعت میں تبدیلی آگئی۔ اب انقباض کے بجائے انبساط محسوس ہو رہا تھا اور الم مبدل بہ راحت تھا۔ اِس بات پر دل انتہائی خوش تھا کہ میرے قدم اُس سرزمین پر ٹک رہے ہیں جو آٹھ سو سال تک اسلامی سلطنت کا مرکز رہی ہے اور جس کی عظمت و جلال اور شکوہ و ہیبت نے اُسے "آستانہ" کا لقب دے رکھا تھا۔ جسے آج ہم ترکی کہتے ہیں یہ عثمانی خلافت کے دَور میں اناضول کہلاتا تھا۔ ہمارے ہاں انگریزی کے اثر سے اس کو اناطولیہ کہا جاتا ہے۔ یہ عثمانی خلافت کے متعدد صوبوں میں سے ایک صوبہ تھا۔ اناضول کے لفظ کو "ترکی" سے بدلنے والے طورانی ترک ہیں جنہوں نے خلافت کو ختم کیا اور نسلی بنیادوں پر لادین ریاست کی بنیاد ڈالی۔ ترکی کے عوام الناس اب بھی اناضول کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ استنبول شہر کے علاوہ ترکی کا تمام علاقہ اناضول ہے۔ استنبول کی سڑکوں پر جگہ جگہ ایسے بورڈ آویزاں ہیں جن پر "اناضولو" لکھا ہے۔ اناضولو ہوٹل، اناضولو بنک۔ مَیں نے ترک دوستوں سے دریافت کیا کہ کیا "اناضول" کا لفظ ابھی تک زندہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ آپ کو متعدد ایسے لوگ ملیں گے جو اب بھی "ترکی" کے بجائے اناضول پسند کرتے ہیں اور اپنے اس پرانے ورثے سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

پاکستانیوں سے ترکوں کی محبت | استنبول ایئرپورٹ پر ترک ملازمین نے میرے ساتھ انتہائی محبت و عقیدت کا برتاؤ کیا۔ یہ دیکھتے ہی کہ مَیں پاکستانی ہوں۔ ہر شخص میری طرف لپکا۔ چونکہ ترکی اور پاکستان کے مابین ویزا کی پابندی اٹھا دی گئی ہے اس لیے جہاز کے تمام مسافروں کے اندر میں واحد شخص تھا جسے "پاسپورٹ کنٹرول" کے سامنے لائن میں کھڑا ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ کنٹرول افسر نے مجھے دیکھتے ہی اشارہ کیا کہ مَیں بلا جھجک اندر چلا جاؤں۔ اس خصوصی امتیاز پر میرے دوسرے تمام رفقائے جہاز جن میں شامی، لبنانی، مصری، انگریز، اور جرمن تھے مجھے بغور گھورنے لگے۔ غالباً وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کاش اُن سے بھی ویزا کا تقاضا نہ ہوتا۔ آر۔سی۔ڈی کے ملکوں نے جس طرح ویزا کی پابندیاں ختم کرکے خیرسگالی کے بہترین جذبات کو تقویت پہنچائی ہے کیا اچھا ہو کہ دوسرے مسلمان ممالک بھی اسے اپنے لیے مثال بنائیں۔ کسٹم والوں نے تو اور بھی کمال کر دکھایا۔ شامیوں اور مصریوں کے سامان کی چیکنگ اِس قدر شدید ہوئی کہ ایک ایک چیز کی تلاشی لی گئی۔ بکسوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا گیا۔ عورتوں کے ہاتھوں میں جو پرس تھے اُن تک کو کھولا گیا۔ مگر مجھ پاکستانی کو یہ فخر حاصل ہے کہ نہ صرف میرا سامان نہیں کھولا گیا، بلکہ قلیوں تک نے محبت سے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور موٹر تک میرا سامان منتقل کرنے پر مجھ سے ایک ترکی لیرا تک لینا گوارا نہ کیا۔ کسٹم کا ایک افسر کچھ نہ کچھ

عوامی عربی (دارجہ) جانتا تھا۔ غالباً ماردین کے علاقے کا ہوگا۔ مجھ سے عربوں کے روایتی انداز میں کہنے لگا: عساک ما تعبت فی الطائرۃ (امید ہے آپ کو جہاز میں کوئی تکلیف نہ ہوئی ہوگی)۔ میں نے کہا الحمدللہ سفر آرام دہ گزرا۔ کہنے لگا "پاکستان میں اسلام بہت ہے۔" میں نے کہا پاکستان بنا ہی اسلام کے لیے ہے۔ اِس پر وہ اپنے کندھوں کو ملا کر کہنے لگا کہ میں نے پاکستان کا بڑا شیخ دیکھا ہے۔ وہ یہاں سے گزرا تھا اور اُس نے نماز پڑھائی تھی۔ خاکسار نے عرض کیا کہ میں اُسی شیخ کا شاگرد اور سکرٹری ہوں۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ میرا سامان موٹر میں رکھ دیا گیا، ورنہ دل چاہتا تھا کہ اُس سے مزید باتیں ہوں۔ وہ بھی اپنے کام سے بے نیاز ہو کر مزید تبادلۂ خیال کرنا چاہتا تھا مگر اتنی سی گفتگو پر اکتفا کرنی پڑی۔ البتہ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ مولانا محترم نے لندن جاتے وقت استنبول کے ہوائی اڈے پر جو نماز پڑھائی تھی ہوائی اڈے کے ملازمین پر اُس کے اچھے اثرات پڑے ہیں۔ استنبول کے دوستوں نے بھی مجھے بتایا کہ ہوائی اڈہ پر اِس انداز میں پہلے کبھی باجماعت نماز نہیں ادا کی گئی۔ اِس نماز کا نہ صرف ایرپورٹ پر چرچا ہُوا بلکہ کئی روز تک یہ واقعہ عوامی حلقوں میں نقلِ محفل بنا رہا۔ ترکی کے اسلامی اخبار اتحاد نے مولانا کے استقبال کی مفصّل خبر شائع کر دی، اور ساتھ ہی مولانا محترم کی ایک ایسی تصویر چھاپ دی جس میں مولانا محترم نماز کے بعد بیٹھے ہوئے دُعا مانگ رہے ہیں۔ اتحاد کی اِس رپورٹنگ نے ترکی بھر میں اِس خبر کو پھیلا دیا اور اہلِ دین کے لیے خوشی کا سامان فراہم کر دیا۔ اتحاد استنبول سے نکلتا ہے اور ۶۰ ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے۔

استنبول میں پہلی رات | میں استنبول یکایک پہنچ گیا تھا۔ استنبول یا انقرہ کے کسی دوست کو اپنی آمد کی پیشگی اطلاع نہ دے سکا تھا۔ استنبول کے محلہ بایزید میں عمر ہوٹل کے اندر میں نے قیام کر لیا۔ یہ ہوٹل استنبول یونیورسٹی کے عقبی دروازے کے سامنے ہے۔ پہلا دن زبان کی اجنبیت کی وجہ سے تنہائی کی حالت میں گزرا۔ روزنامہ بُگن کے ایڈیٹر محمد شوکت صاحب کو ہوٹل سے دو تین مرتبہ فون کیا مگر وہ نہ مل سکے۔ رات کو نماز تراویح کے لیے قریب کی جامع مسجد میں گیا۔ یہ مسجد سلطان بایزید کے نام سے موسوم ہے اور استنبول یونیورسٹی کے صدر دروازے کے بالکل سامنے ہے۔ یونیورسٹی کے طلبہ بالعموم اِسی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ یونیورسٹی کے صدر دروازہ پر قرآن کریم کی یہ آیت جلی حروف میں کندہ ہے کہ: "لَا یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ"۔ جامع بایزید نہایت وسیع و عریض مسجد ہے اور ہزارہا نمازیوں کے لیے اس میں گنجائش ہے۔ نماز تراویح میں میرے اندازے کے مطابق دس ہزار کے قریب نمازی موجود تھے۔

عورتوں کی تعداد بھی دو ڈھائی سو سے کم نہ ہوگی۔ عورتوں کے لیے مسجد میں ایک الگ جگہ مخصوص ہے جسے ترک گوشۂ خانم کہتے ہیں۔

دو عربی آشنا دوستوں سے تعارف نماز تراویح کے بعد ہوٹل میں واپس آرہا تھا کہ راستے میں اتفاقاً ایک ترک نوجوان سے تعارف ہوگیا۔ میں نے راستے میں ایک دکان سے سحری کے لیے پھل خریدے اور جب دام دینے لگا تو اس نوجوان نے جو میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا دکاندار سے کہا کہ دام میں دوں گا، اس پاکستانی سے دام نہ لینا۔ چنانچہ دام اُس نے ہی ادا کیے۔ بعد میں اِس نوجوان سے جب بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان کا نام عبدالقادر سیزگین ہے۔ استنبول کے مدرسہ امام وخطیب کے فارغ شدہ ہیں اور اب استنبول یونیورسٹی میں انسٹی ٹیوٹ آف ہائر اسلامک اسٹڈیز میں پڑھتے ہیں اور آخری سال میں ہیں۔ مولانا محترم کی وہ تمام کتابیں جو اب تک ترکی میں ترجمہ ہو چکی ہیں پڑھ چکے ہیں۔ عربی زبان پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں مگر بولنے پر زیادہ قدرت نہیں رکھتے۔ عبدالقادر سیزگین کی وساطت سے استنبول کے احباب سے ملنے کا موقع نکل آیا۔ عبدالقادر سیزگین میری بات تو خوب سمجھ لیتا تھا مگر بے چارا اپنا مافی الضمیر ادا کرنے پر قادر نہ تھا۔ اُس کا چہرہ بتاتا تھا کہ جذبات سے بھرپور ہے۔ رات دیر تک میرے پاس ہوٹل میں بیٹھا رہا اور اپنی شکستہ عربی سے میری تنہائی کو ختم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ دوسرے روز علی الصبح ایک اچھے عربی دان دوست کو ساتھ لے آیا۔ یہ صاحب بھی ہمارے پرانے آشنا نکلے۔ ان کا نام محمد شاہین ہے۔ جامع لالالی کے خطیب ہیں۔ اسلامی مجلہ ہلال کے ادارۂ تحریر میں شامل ہیں۔ عربی زبان خوب جانتے ہیں اور ہلال کے اندر مولانا محترم کے جو مضامین شائع ہوتے ہیں اُن میں سے اکثر وبیشتر انہوں نے ہی عربی سے ترکی میں ترجمہ کیے ہیں۔

عربی زبان کی سخت جانی عبدالقادر سیزگین کی سرگرمی اور تعاون کی بدولت عمر ہوٹل میں دوستوں کی آمد شروع ہوگئی۔ استنبول کے مدرسۂ امام وخطیب کے طلبہ اور اساتذہ کی ایک تعداد بھی آگئی۔ پروفیسر عزیز، نائف آفندی اور شیخ یوسف اور کئی دوسرے دوست جمع ہوگئے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک مولانا محترم کا ترکی لٹریچر پڑھ چکا ہے اور صرف اسلامی اخوت کی بنیاد پر ہی اظہارِ محبت نہیں کر رہا ہے بلکہ تحریکی جذبہ کی ہم آہنگی بھی اس محبت میں شامل ہے۔ ترکی آنے سے پہلے جس بات کا ہر وقت خدشہ لاحق رہتا تھا وہ زبان کا مسئلہ تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ترکی میں عربی بولنے والے شاذ ونادر ہوں گے۔ کیونکہ مصطفیٰ کمال اور اُس کے ناعاقبت اندیش ساتھیوں نے عربی زبان اور عربی

رسم الخط کو ترکی کے اندر ختم کرنے کے لیے جس تشدد اور سفاکیت کا مظاہرہ کیا ہے اُس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اسرائیل بھی عربی کے بجائے عبرانی زبان کو رائج کر رہا ہے، مگر تشدد کے بجائے دوسرے کارگر ہتھکنڈوں کے ذریعے۔ ترکی میں اس تشدد اور سفاکیت کے باوجود عربی کے لیے ہر طرح کے دروازے بند کر دینے کے علی الرغم آج عربی بولنے والوں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ اِسے عربی کی سخت جانی اور اسلام کا معجزہ قرار دے لیں یا طورانی جماعت کی غلط اندیشی۔

دو سوال دن بھر ہوٹل میں رہا۔ احباب تشریف لاتے رہے۔ ہر شخص کی زبان سے سب سے پہلے جو سوال نکلتا تھا وہ یہ تھا کہ "حضرت مودودی کی صحت کیسی ہے؟" یہ وہ سوال تھا کہ اِس سفر میں مَیں جہاں جہاں گیا ہوں سب سے پہلے اِس سوال کا جواب دینا ہوتا تھا۔ مولانا محترم کے سفر لندن اور پھر اپریشنوں کی خبر دنیا میں اِس قدر پھیلی ہے کہ ہر شخص کی نگاہیں مولانا محترم پر لگی ہوئی تھیں اور وہ مولانا محترم کی صحت کی خبر سننے کے لیے بیتاب تھا۔ مولانا محترم جب علاج کے لیے لندن روانہ ہوئے تو ہمیں ایک ثقہ عرب دوست نے بتایا کہ پاکستان کے بعض سرکاری حلقوں کی طرف سے عربوں کے اندر یہ پروپگنڈا کیا جا رہا ہے کہ مولانا برطانیہ میں علاج کی غرض سے نہیں گئے بلکہ دوسرے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے گئے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے افترا پردازی کرنے والوں کو اِس مرتبہ بھی اُسی طرح رُوسیاہ اور خائب و خاسر کیا جس طرح وہ پہلے ایسے لوگوں کو رُسوا کرتا رہا ہے۔ مَیں جب دوستوں کو مولانا محترم کی صحت کی بشارت دیتا تو وہ بڑے شادماں ہوتے اور اللہ کا شکر بجا لاتے۔ ترکی کے اخبارات میں بھی مولانا محترم کے اپریشنوں کی خبریں وقتاً فوقتاً چھپتی رہی ہیں اور استنبول سے اَدَنہ تک کے لوگ صورتِ احوال سے کسی نہ کسی حد تک آگاہ رہے ہیں۔

دوسرا مجھ سے سوال بار بار یہ کیا گیا کہ مولانا محترم ترکی کب تشریف لا رہے ہیں۔ راقم الحروف اس سوال کا قطعی جواب دینے سے معذور تھا۔ اس لیے کہ اِس امر کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مولانا محترم پاکستان جاتے ہوئے راستے میں ترکی یا کسی اور مقام پر ٹھیرنے کی ہمت رکھتے ہیں یا نہیں۔ بہرحال ترکی میں یہ خبر عام تھی کہ مولانا محترم ترکی ٹھیریں گے اور ایک کانفرنس سے خطاب کریں گے۔ لوگ اِس خبر پر بے حد مسرور تھے اور انتظار کے ایام گن رہے تھے۔ مَیں ترکی میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا۔ ہر شخص مجھ سے مولانا محترم کے ترکی میں پہنچنے کی تاریخ پوچھنے لگا۔

امام و خطیب ہائی اسکول میں افطاری مدرسہ امام و خطیب کے پرنسپل کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ آج

شام میری افطاری کی دعوت مدرسہ میں ہے۔ سارا دن ہوٹل میں گزرا۔ شام کو عبدالقادر سنبرگن کی معیت میں مدرسہ امام خطیب گیا۔ یہ مدرسہ استنبول کی مشہور مسجد جامع محمد الفاتح کے قریب ہے۔ مدرسہ کے دروازے پر مدرسہ کے پرنسپل اور اساتذۂ کرام نے میرا استقبال کیا۔ اساتذہ سے الگ الگ تعارف کرایا گیا۔ اساتذہ کے اندر عربی جاننے والوں کی ایک تعداد تو موجود تھی ہی، ایک ایسے اُستاذ بھی ملے جو اُردو زبان بھی نہایت اعلیٰ بولتے ہیں۔ مَیں نے اُن سے دریافت کیا کہ کیا آپ اصلاً ترک ہیں یا ہندوستانی ؟ بتانے لگے کہ میں خالصتہً ترک ہوں۔ البتہ مجھے اردو سیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اِس غرض کے لیے میں لکھنؤ گیا اور وہاں تین سال تک رہا ہوں، اور لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضلِ ادب کی ڈگری حاصل کی ہے۔ انہوں نے اپنا نام یوسف صالح قرجہ بتایا۔ یہ اس وقت امام خطیب ہائی اسکول میں بھی لیکچرر ہیں اور استنبول یونیورسٹی کے ہائر اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ میں بھی پروفیسر ہیں۔ ۴۰ سال کے بھرپور اور صحت مند نوجوان ہیں۔ ایک غیر ملکی مسلمان کا اِس قدر شوق سے اُردو سیکھنا اور پھر اس سے دین کی خدمت کا کام لینا بہت قابلِ قدر بات ہے۔ آج تک مجھے کوئی ایسا عرب نہیں ملا جس نے باقاعدہ اُردو زبان کو اس ذوق و شوق سے سیکھا ہو اور اسے دعوتِ دین کا ذریعہ بنایا ہو۔ عرب اس فضیلت سے محروم ہیں۔ البتہ انہیں انگریزی سیکھنے اور بولنے کا بے حد شوق ہے۔ سعودی عرب کے اندر تو نوجوانوں کو انگریزی سیکھنے کا اِس قدر جنون لاحق ہوتا جا رہا ہے کہ خود اپنی عربی سے اب انہیں نفرت سی ہونے لگی ہے۔

امام و خطیب ہائی اسکول کی اجتماعی افطاریاں مدرسہ امام و خطیب کے اندر افطاری کا وسیع دستر خوان بچھا ہوا تھا۔ پرنسپل صاحب نے بتایا کہ پُورے رمضان میں یہ دستر خوان بچھا رہا ہے۔ پرنسپل جو ایک سابق فوجی جرنیل ہیں اور بہترین منتظم ہیں نے بتایا کہ اِن افطاریوں کا پس منظر یہ ہے کہ یہ افطاریاں اسکول یا طلبہ کے حساب میں نہیں ہوتیں بلکہ شہر کے صاحبِ ثروت حضرات میں سے کوئی نہ کوئی شخص ایک افطاری اپنے ذمہ لے لیتا ہے، وہ خود بھی اس میں شریک ہوتا ہے اور شہر کے دیگر معززین کو بھی شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ اِس طرح نہ صرف یہ افطاری ایک روحانی اجتماع کی صورت اختیار کر جاتی ہے بلکہ طلبہ اور اساتذہ کو شہر کے اچھے اچھے لوگوں سے ملنے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے۔ آج کی افطاری کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ اس میں دو ہزار کی حاضری ہے۔ ایک ہزار ۳ سو طلبہ ہیں اور ۵۰ اساتذہ کچھ اسکول کے دوسرے متعلقہ حضرات ہیں مثلاً ڈاکٹر اور ناظمینِ شعبہ جات وغیرہ۔ اور باقی معززینِ شہر ہیں۔ معززینِ شہر میں اسمبلی کے ارکان، یونیورسٹی کے پروفیسر،

اور تجار اور وکلاء شامل ہیں۔ علماء کی ایک جماعت بھی موجود ہے۔ ترکی کے معمر شیخ الاسلام بھی موجود ہیں جو عثمانی دور کے آخری ایام میں اس منصب پر فائز تھے اور مصطفیٰ کمال اور عصمت انونو کے دور میں بھی اپنی عوامی مقبولیت اور علم و فضل کی وجہ سے قابلِ احترام سمجھے جاتے رہے ہیں اور ان سے تعرض کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی۔ جن صاحب کی طرف سے افطاری کی دعوت دی گئی ہے پرنسپل صاحب نے اُن سے خصوصی تعارف کرایا۔ تعارف سے معلوم ہوا کہ وہ استنبول کے بہت اونچے تاجروں میں سے ہیں۔ استنبول میں اُن کا ایک اعلیٰ درجے کا ریسٹورنٹ ہے جو اصحابِ ذوق کا مرجع ہے انہوں نے مدرسہ امام و خطیب کے طلبہ و اساتذہ اور شہر کے ائمہ اور مفتیوں کے لیے یہ اعلان کر رکھا ہے کہ ان میں سے کوئی اگر ان کے ریسٹورنٹ میں کھانا کھائے یا چائے پیئے تو اُس سے پچیس فیصد کم دام لیے جائیں گے۔ اہلِ دین سے ترکوں کو جو محبت ہے یہ اُس کا ایک معمولی سا ثبوت ہے۔

افطاری میں میرے بائیں جانب جناب شیخ الاسلام عمر نصوحی صاحب تشریف فرما تھے۔ کافی ضعیف العمر ہیں۔ دھیمے انداز میں بات کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ اب حضرت مودودی کا کیا حال ہے۔ خاکسار نے عرض کیا کہ اُن کا دوسرا اپریشن بھی ہو گیا ہے جو بفضلِ خدا کامیاب رہا ہے، اور اب وہ چند روز تک پاکستان واپس لوٹنے والے ہیں۔ شیخ الاسلام فرمانے لگے اللہ تعالیٰ حضرت کو کامل صحت اور طویل زندگی عطا فرمائے۔ مجھے اُن سے بڑی محبت ہے۔ اُن کی کتابیں ہمارے نوجوانوں کے اندر دین کی صحیح اسپرٹ پیدا کر رہی ہیں۔ میری تمنّا ہے کہ وہ لندن سے واپسی پر یہاں چند روز کے لیے تشریف لائیں۔

تقریریں | افطاری کے بعد مختصر تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے بھی تقریر کرنے کی دعوت دی گئی۔ پرنسپل صاحب نے یوسف صالح قرجہ کو ترجمانی کے لیے کہا۔ محفل میں باقاعدہ لاؤڈ اسپیکر کا انتظام تھا۔ نشستوں کی ترتیب میں بڑے سلیقہ کا ثبوت دیا گیا تھا۔ ۲ ہزار کی تعداد کے لیے میزوں اور کرسیوں کا کھلا انتظام تھا۔ یوسف صالح قرجہ نے بتایا کہ میری تقریر کا موضوع ہے "جماعتِ اسلامی پاکستان کا تعارف"۔ مَیں نے جب اِس موضوع کے بارے میں کچھ تردّد کا اظہار کیا تو قرجہ صاحب کہنے لگے کہ اِس وقت تمام دوستوں کی یہی خواہش ہے۔ یہاں جتنی حاضری آپ دیکھ رہے ہیں یہ لوگ مولانا مودودی کو نہ صرف جانتے ہیں بلکہ اُن کی کتابیں پڑھ چکے ہیں اور ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ ہوگی کہ آپ مولانا مودودی کی جماعت کا مختصراً تعارف انہیں کرا دیں۔ چنانچہ حاضرین کے اصرار پر

اٹھ کھڑا ہوا۔ شیخ الاسلام صاحب نے بھی تھپکی دی کہ میں کچھ نہ کچھ ضرور بیان کروں۔

میرے سامنے جو حاضرین موجود تھے انہیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ امام و خطیب اسکول کے نام سے طلبہ اور اساتذہ کا جو تصور میں نے قائم کر رکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ میرا خیال تھا کہ ان مدارس میں اُسی نوعیت کے اماموں اور خطیبوں کی کھیپ تیار ہو رہی ہے جو ہندو پاکستان کے اکثر دینی مدارس میں تیار ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ یہاں تازہ دم، صحت مند، زندگی کی توانائیوں سے بھرپور عنصر جمع ہے۔ ان کے چہرے غمازی کر رہے ہیں کہ دین سے گہرا عشق ان کو اس ادارے میں کھینچ لایا ہے۔ چنانچہ میں نے اسی احساس کے تحت اُن کے سامنے مختصر سی تقریر کی۔ جس میں میں نے پہلے جماعت کی تاریخ اور دعوت اور مقصد و طریق کار پر اجمالی سا اشارہ کیا اور پھر میں نے ترکوں کی تاریخ اور ترکوں کی عظیم الشان اسلامی خدمات کو بیان کیا۔ میں نے کہا کہ عثمانی ترکوں نے یورپ اور ایشیا میں ۸ سو سال تک اسلام کا جھنڈا لہرایا ہے۔ اب پھر زمانہ اس انتظار میں ہے کہ یہ جری اور بہادر قوم اسلام کا جھنڈا ہاتھ میں لے اور کفر و الحاد کی تاریکیوں میں اسلام کی شمع روشن کرے۔ آپ کے یہ مدارس جنہیں آپ مدارس ائمہ و خطباء کہتے ہیں یہ غازیانِ اسلام کی تربیت گاہیں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے چشمے ہیں۔ امید ہے یہی مدارس ترک قوم کو بیدار کرنے اور اُسے اپنے اصل مشن سے باخبر کرنے کا فرض سرانجام دیں گے۔ ماضی میں اگر فولادی ہتھیاروں کو جہاد کے میدان میں استعمال کیا گیا ہے تو اب اِس زمانے میں فکری اور علمی اسلحہ کے بغیر اس جہاد میں کامیابی نہیں ہو سکے گی ہم امید رکھتے ہیں کہ آپ میں سے ہر ہر فرد محمد الفاتح بن کر اٹھے گا اور باطل کی اس یلغار کو جو کفر و الحاد اور یہودیت و صلیبیت کے مختلف پردوں میں اسلامی دنیا پر حملہ آور ہو رہی ہے اُس کا سدباب کرے گا۔

ترک نوجوانوں کا اسلام سے لگاؤ میں نے مختصراً اپنے خیالاتِ پریشاں پیش کر دیئے۔ ترجمہ صاحب نے ترجمانی کی۔ مگر میں اس بات پر خاصا حیران رہا کہ میری ان گزارشات کا اسکول کے نوجوانوں نے بڑا خیر مقدم کیا۔ اور اسلام اور اسلامی جہاد اور اسلامی عظمت کی بحالی کے الفاظ پر جی بھر کر تالیاں بجائیں۔ پاکستان یا سعودی عرب میں تو اسلام کا نعرہ لگا دینا کوئی مشکل نہیں ہے۔ مگر ترکی کے نوجوان عنصر کے اندر جس کی پرورش ہی لادینی دستور، لادینی نظامِ حکومت، لادینی تہذیب اور لادینی حکمرانوں کے زیر اثر ہوتی ہے اُس کا اسلام کے نام پر اس قدر اچھل پڑنا فی الواقع ایک زندہ معجزہ سے کم نہیں ہے۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ اسلام کا احیاء ترکی کی تنگ و تاریک گلیوں میں ہو رہا ہوگا۔ مگر یہاں آکر

معلوم ہوتا کہ کھلے بازار میں اسلام کا نعرۂ حق گونج رہا ہے۔ مسجد سے بھی یہ آواز اٹھ رہی ہے اور مدرسہ سے بھی۔ اور اسے اُٹھانے والے بوڑھے نہیں ہیں، بہترین دم خم رکھنے والے نوجوان ہیں۔

پارلیمنٹ کے ایک رُکن کی جوابی تقریر میری تقریر کے بعد ترکی پارلیمنٹ کے ایک رُکن جناب عثمان سراج اُٹھے اور انھوں نے میری گذارشات کی تائید کرتے ہوئے علی الاعلان کہا کہ ہم یہاں احیائے اسلام کی پوری کوشش کر رہے ہیں میں نوجوانوں کو ہر محفل میں اس فرض کی جانب متوجہ کر رہا ہوں۔ اور امید ہے ترکی کا نوجوان مستقبل قریب میں اُن تمام امیدوں کو بروئے کار لانے کا اہل ثابت ہوگا جن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اجتماع منتشر ہوگیا۔ شیخ عمر نصوحی صاحب نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ اور ہم پرنسپل صاحب کے کمرے میں چلے گئے۔ وہیں نماز مغرب ادا کی۔ نماز کے بعد شیخ عمر نصوحی، یوسف صالح ترجہ اور پرنسپل صاحب اور کچھ دوسرے حضرات سے بات چیت ہوتی رہی۔

شیخ الاسلام عمر نصوحی شیخ عمر نصوحی کا پورے ملک میں بڑا زبردست احترام پایا جاتا ہے۔ موصوف کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اِن میں سے کچھ چھپ چکی ہیں اور اکثر غیر مطبوعہ ہیں۔ تفسیر اور مفسرین کی تاریخ پر بھی کئی جلدوں میں ان کی ایک تصنیف ہے جسے ترکی کے محکمہ امورِ مذہبی نے شائع کیا ہے۔ اسلامی فقہ پر موصوف کو زبردست عبور حاصل ہے۔ انہوں نے اُس دور میں بھی تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا ہے جب یہ شغل جاری رکھنے والوں کے سر قلم ہوتے رہے اور دین کو پکڑ کر رکھنا آگ کا انگارہ مٹھی میں لینے کے مترادف تھا۔

ترکی میں لادینیت کی تاریخ مَیں نے یہ موقع غنیمت سمجھ کر شیخ عمر نصوحی سے اُس دور کے حالات سننے کی خواہش ظاہر کی جب ترک قوم کو دین سے بیگانہ کرنے کی مہم چل رہی تھی۔ کیونکہ شیخ عمر نصوحی نہ صرف یہ کہ اس دور کے عینی شاہد ہیں بلکہ خود ان حالات کو بھگت چکے ہیں۔ شیخ نصوحی پچھلے حالات کو چھیڑنا پسند نہ کرتے تھے۔ انہوں نے اِس پر مسرت کا اظہار کیا کہ اُن کی آنکھوں کے سامنے دین پر جو طوفان خیز آزمائشیں ٹوٹیں اور پورا ملک ایک شبِ تاریک میں تبدیل ہوگیا، وہ اب ختم ہو رہی ہیں اور قبل اس کے کہ وہ اِس دنیا سے رخصت ہوں اپنی آنکھوں سے نوجوانوں کا دین کی عام بیداری کے ایمان افروز منظر دیکھ رہے ہیں۔ شیخ نے بتایا کہ ایک ہزار سال سے زائد عرصہ تک جو ملک اسلام کا گہوارہ رہا، بلکہ اسلام کا محافظ رہا، اُسے صرف آٹھ سال کے اندر اسلام سے بیگانہ کرنے کی کوشش کی گئی

۱۹۲۴ء سے تبدیلی کا یہ سلسلہ شروع ہوا اور ۱۹۳۲ء تک جاری رہا۔ موضوع نازک تھا۔ سب کے دلوں کے تار ہل گئے۔ مجلس میں ایک اور صاحبِ علم بیٹھے تھے۔ انہوں نے تاریخی ترتیب کی رعایت سے بتایا کہ سلطان محمد وحید الدین آخری عثمانی خلیفہ تھے۔ مصطفیٰ کمال نے ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو انہیں اختیارات سے محروم کر دیا اور صرف امورِ مذہبی کے سربراہ کی حیثیت سے ان کو باقی رکھا۔ ۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کو بالآخر نیشنل اسمبلی نے خلافت پر بھی خطِ تنسیخ پھیر دیا۔ اسمبلی نے اسی اجلاس میں وزارتِ شریعت اور وزارتِ اوقاف کو بھی منسوخ کر دیا۔ کچھ دنوں بعد شرعی عدالتیں ختم کر کے انہیں سول عدالتوں کے اندر ضم کر دیا گیا۔ اس کے بعد مصطفیٰ کمال نے دوسرا بھرپور قدم اٹھایا اور تمام دینی مدارس اور دینی اداروں کو بند کر دیا اور ایک بے اختیار اور نیم مُردہ سا مذہبی ادارہ "محکمۂ امورِ مذہبی" کے نام سے کھول دیا۔ بلکہ حکومت نے دینی تعلیم کے معاملے میں یہاں تک تشدد برتا کہ پرائمری اسکولوں کے اندر چھوٹے چھوٹے بچوں کو یہ سکھانا شروع کر دیا کہ ہماری پسماندگی کا اصل سبب دین ہے۔ ترکوں کو جتنے مصائب و حوادث کا سامنا کرنا پڑا ہے ان سب کا ذمہ دار دین ہے۔ حکومت نے باقاعدہ سابقہ ترکی دستور کے اندر سے یہ یہ فقرہ حذف کر دیا کہ "ریاست کا مذہب اسلام ہو گا"۔ اس تبدیلی کے بعد تمام اسلامی قوانین منسوخ کر دیئے۔ اسلامی شریعت کو یہ لوگ "شریعتِ عتیقت" کہتے تھے یعنی بوسیدہ قانون۔ اسلامی قوانین کے بجائے ان لوگوں نے سوئٹزر لینڈ کا سول لا اور اٹلی کا فوجداری قانون عوام الناس کی روایات و عادات کا لحاظ کیے بغیر ٹھونس دیا۔ شروع شروع میں تو خود جج ان نئے اور نامانوس قوانین کی وجہ سے سخت ذہنی اور فکری پراگندگی میں مبتلا ہو گئے اور عدالتوں کے اندر کئی کئی سال تک مقدمات فیصلہ کے بغیر پڑے رہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس صوفیاء کے تمام سلسلے بھی ممنوع قرار دے دیئے اور عیسائی پادریوں کی طرح علماء کے لیے ایک خاص یونیفارم مقرر کیا۔ یعنی سیاہ جبہ اور سفید عمامہ۔ عوام الناس کو ہیٹ اور سوٹ پہننے پر مجبور کیا گیا۔ ایک کروڑ باشندوں کے لیے یکایک اتنی بڑی مقدار میں ہیٹ فراہم کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس غرض کے لیے یورپ بھر سے ہر طرح کا ردّی (CONDEMNED) مال درآمد کیا گیا۔ جمعۃ المبارک کے بجائے اتوار کو چھٹی کا دن قرار دیا گیا۔ حکومت نے مذہبی احساسات کو یہاں تک کچلنے کی کوشش کی کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے اجتماعات بھی اُسے گوارا نہ تھے۔ اُس نے اِن اجتماعات کو بھی پہلے خلافِ قانون قرار دے دیا اور پھر اس قانون پر جب بہت اضطراب پیدا ہوا تو اسے تبدیل کر دیا

گیا۔ ہجری جنتری کو ختم کر دیا گیا۔ عربی اذان ممنوع قرار دے دی۔ وراثت کے قانون میں بنیادی تبدیلی کر ڈالی اور مرد و عورت کو وراثت میں برابر کا حصہ دار ٹھیرا دیا گیا۔ وراثت کے اصل حصہ داروں (ذوی الارحام) کو فروع بنا دیا اور قانونی نظام کے اندر ایسا انتشار پیدا ہوا کہ توبہ ہی بھلی۔ ترکی کا اسلام سے ہر طرح کا رشتہ کاٹنے کے لیے بالآخر دارالحکومت کو استنبول سے انقرہ منتقل کر دیا گیا کیونکہ استنبول مسجدوں اور مذہبی اداروں کا شہر ہے اور یہاں کے چپے چپے سے عثمانی تہذیب جھلک رہی ہے۔ اس لیے ایک نئی زندگی کا افتتاح کرنے کے لیے یہ شہر موزوں نہ سمجھا گیا۔ انقرہ بالکل ایک معمولی سا قصبہ تھا۔ اُسے دارالحکومت بنا دیا گیا اور شہر کے اندر مسجد کی تعمیر ممنوع قرار دی گئی۔

ترکی کی ماضی قریب کی یہ داستان جب بیان کرنے والا بیان کر رہا تھا تو سب لوگ چپ چاپ بیٹھے سن رہے تھے۔ اُن کے چہروں کا بدلتا ہوا رنگ بتا رہا تھا کہ اِس داستان نے اُن کے پُرانے زخم تازہ کر دیئے ہیں۔ جو صاحب ان واقعات کو دہرا رہے تھے انہوں نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اس ملک پر سب سے زیادہ آزمائش کی گھڑی وہ تھی جب عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط نافذ کیا گیا۔ یہ تبدیلی چونکہ تاریخ، فطرت اور روایات کے سراسر خلاف اور معقولیت کے ہر پہلو سے عاری تھی اس لیے نہ صرف عوام کے لیے اس کو قبول کرنا آسان نہ تھا بلکہ خود حکومت کو بھی سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت نے اپنے تمام ذرائع اِس تبدیلی پر لگا دیئے اور اُن تمام لوگوں کو جو لاطینی حروف کا علم رکھتے تھے جمع کیا گیا اور انہیں عوام کی تعلیم کے لیے بجبر مامور کیا گیا۔ ۱۰ اگست ۱۹۲۸ء کو پہلی مرتبہ انقرہ کے اندر لاطینی حروف کے رواج کا اعلان کیا گیا اور اس اعلان کے ساتھ وہ تمام مطبوعہ کتابیں جو عربی زبان میں موجود تھیں انہیں جمع کر کے مصر، ایران اور دوسرے ممالک کو برآمد کر دیا گیا۔ چھاپہ خانہ والوں کو حکم دے دیا گیا کہ وہ عربی حروف کی پلیٹیں چھاپہ خانوں میں نہیں رکھ سکتے۔ کالجوں کے نصاب میں سے عربی اور فارسی زبانیں نکال دی گئیں کیونکہ اب اُن کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ اسی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ ترکی زبان کے اندر سے عربی اور فارسی کے الفاظ کو چن چن کر نکالا گیا اور اُن کے بجائے ترکی زبان کے عامی الفاظ کو شامل کیا گیا یا فرانسیسی الفاظ کو اختیار کیا گیا۔ ۱۹۴۵ء میں ترکی کا دستور لاطینی زبان میں شائع ہوا۔

(باقی)